حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اٹھائیسویں قسط)

تدریس

حج کے یہ واقعات ۱۹۶۴ء کے ہیں۔ اُس وقت دارالعلوم میں میرے سپرد ایک تو تدریس تھی، دوسرے فتویٰ نویسی کی مشق بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ نگرانی جاری تھی۔ تیسرے میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایماء سے اپنے طور پر انگریزی اور کچھ عصری مضامین پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ ان تینوں کاموں کا کچھ خلاصہ یہاں پیش کرتا ہوں۔

دارالعلوم میں میری تدریس بالکل ابتدا سے شروع ہوکر درجہ بدرجہ آگے بڑھتی رہی، اور سلم العلوم اور میبذی کے سوا درسِ نظامی کی تمام کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔ ہمارے استاذِ مکرم حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے تدریس کا یہ طریقہ سیکھا تھا کہ پہلے طالب علم سے عبارت پڑھواتے، اور اگر پڑھنے میں کوئی غلطی ہوتی، تو اس کی اصلاح فرماتے، اور غلطی کی وجہ خود طالب علم ہی سے نکلوانے کی کوشش کرتے۔ پھر جو عبارت پڑھی گئی ہے، کچھ دیر کے لئے کتاب سے ہٹ کر اُس کا خلاصہ طلبہ کو براہِ راست مخاطب کرکے سمجھاتے تھے، جب یہ اطمینان ہوجاتا کہ طلبہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، تو دوبارہ کتاب کی طرف لوٹ کر عبارت کا ترجمہ کرتے، اور جو مفہوم سمجھایا تھا، اُس پر عبارت کو منطبق فرماتے تھے۔ میں نے تدریس کے دوران اسی طریقے کی اتباع کی، اور اُس کا بہت فائدہ محسوس کیا۔ حضرت استاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہمیں یہ بھی تلقین تھی کہ جب درس سے پہلے کتاب کا مطالعہ کرو، تو اُس وقت ہی خود سمجھنے کے ساتھ یہ بھی سوچا کرو کہ یہ مضمون طلبہ کو آسان انداز میں کس ترتیب سے اور کس طرح سمجھانا ہے کہ طالب علم کے ذہن پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ چنانچہ میرا معمول یہ رہا کہ جس علم کی بھی کوئی کتاب پڑھانی ہوتی، اُس کی عربی شروح، بلکہ دوسری

خارجی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتا، لیکن طلبہ کے سامنے صرف اتنی بات عرض کرتا جسے وہ آسانی سے ہضم کرسکیں۔

ہمارے طرزِ تعلیم اور کالجوں یونی ورسٹیوں کے طرزِ تعلیم میں یہ بڑا فرق ہے کہ وہاں کتاب پڑھانے سے زیادہ جو علم پڑھایا جارہا ہے، اس کی اہم باتوں کو لیکچروں کی مدد سے سمجھایا جاتا ہے، لیکن عام طور پر کوئی کتاب باقاعدہ نہیں پڑھائی جاتی۔ اس سے اُس علم کے بنیادی مسائل تو طالب علم سمجھ لیتا ہے، لیکن چونکہ کسی خاص کتاب کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی، اس لئے اگر خود اپنے مطالعے سے کچھ سمجھنا چاہے، تو عموماً اس کی عادت نہیں پڑتی۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں کسی بھی علم کی کسی کلاس کی کتاب کو اُس علم کے سمجھانے کے لئے بنیاد بنایا جاتا ہے، اور طالب علم کو کتاب سے وابستہ کردیا جاتا ہے جس سے اُسے خود براہ راست کتابوں کے مطالعے اور اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی عادت پڑتی ہے۔ لیکن بعض اوقات کتاب حل کرنے کی کوشش میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ کتاب کی تعبیرات اصل بن جاتی ہیں، اور علم پیچھے رہ جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات کتاب کو اس طرح پڑھایا جاتا ہے کہ مصنف کے خلاف اٹھنے والے ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، اور مصنف سے کوئی غلطی ہوئی ہو، تو اس کی بھی تاویل کرنا ضروری سمجھ لیا جاتا ہے۔

افراط و تفریط کے درمیان معتدل راستہ یہ ہے کہ اصل میں مقصود علم سکھانا ہو، اور ساتھ ساتھ کتاب سے طالب علم کی اتنی مناسبت پیدا کردی جائے کہ وہ اس علم کی کتابوں کا خود مطالعہ کرنا چاہے، تو اُسے دشواری نہ ہو۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کا طرزِ تدریس یہی تھا کہ وہ صرف کتاب نہیں، بلکہ کتاب کے ساتھ علم پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے جو کتابیں پڑھیں، ان میں ان کا بھی یہی طریقہ دیکھا، اور اُس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لئے صرف زیرِ درس کتاب کے بجائے اُس علم کی دوسری کتابوں سے بھی مدد لینی پڑتی تھی۔

تفسیر کی تدریس

دارالعلوم میں تیسرے درجے سے ہر سال ترجمۂ قرآن کریم کا ایک سبق ہوتا تھا۔ اُس کے تمام حصے مختلف سالوں میں پڑھانے کی نوبت آئی، اور تفسیر جلالین بھی پڑھائی، لیکن مجھے یہ احساس تھا کہ تفسیر قرآن کریم کا کوئی زیادہ معیاری درس بھی ہونا چاہئے۔ اس کے لئے میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

یہ درخواست کی کہ دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے طرز پر دورۂ تفسیر بھی شروع کیا جائے، اور اُس کے لئے یہ تجویز دی کہ تفسیر کی کوئی مفصل کتاب پڑھانا تو ایک سال میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح دورۂ حدیث میں استاذ اور طالب علم کے سامنے متن حدیث کی کوئی کتاب ہوتی ہے، اور استاذ اُس کی مختلف شروح کا مطالعہ کرکے اہم مباحث کا خلاصہ تقریر کی صورت میں بیان کرتا ہے، اسی طرح متن قرآن کریم طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ہو، اور استاذ مختلف تفاسیر کا خود مطالعہ کرکے اہم تفسیری مباحث تقریر کی صورت میں بیان کرے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس تجویز کو پسند فرمایا، اور قرآن کریم کے دس دس پارے تین مختلف اساتذہ پر تقسیم کرکے انہیں اسی طرح پڑھانے کا حکم دیا۔ میرے پاس سورۂ شعراء سے آخر تک کا حصہ آیا، اور میں نے اس کو بڑی دلچسپی سے اس طرح پڑھایا کہ اہم تفاسیر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی اور بالخصوص امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کرکے اہم تفسیری مباحث کا خلاصہ طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس دوران تفسیر کبیر کا تقریباً باستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اور اندازہ ہوا کہ اُس کے بارے میں جو کسی نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ: "فیہ کلّ شیء إلاّ التّفسیر" (یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) وہ اس تفسیر پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام راز ، حمۃ اللہ علیہ نے جس انضباط کے ساتھ تفسیری مسائل کو مرتب انداز میں پیش کیا ہے، اس کی کوئی نظیر کسی اور تفسیر میں موجود نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے کلامی مسائل کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے، لیکن یہ سب کچھ وہ تفسیر کی وضاحت کے بعد کرتے ہیں اور ان کے زمانے میں اس کی ضرورت بھی تھی، لیکن اس کی وجہ سے ان کی تفسیری قدر وقیمت کو کسی طرح کم نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر نظم قرآن کریم اور آیات کریمہ کے باہمی ربط پر ان کا کلام عام طور سے بڑا اطمینان بخش ہوتا ہے۔ بہر حال! اُس سال تفسیر کے اس درس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ بعض طلبہ نے میری یہ تقریر ضبط بھی کی۔ خاص طور پر مولانا محمد اسحاق جہلمی نے (جو اس وقت دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے استاذ ہیں) اُسے بڑے اہتمام سے ضبط کیا۔

حدیث کی تدریس

اس طرح ہوتے ہوتے ہماری تدریس مشکوۃ شریف تک پہنچ گئی۔ اور اس کے بعد دورۂ حدیث کا بھی کوئی سبق ملنے لگا۔ جہاں تک یاد ہے، سب سے پہلے ابن ماجہ کا درس میرے سپرد ہوا۔ اُس وقت ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے، اور ان کے منفرد نظریات کا بڑا شور تھا۔ "سنت"

کے بارے میں ان کے کچھ عجیب وغریب نظریات تھے جن کا آخری نتیجہ احادیث پر عدم اعتماد کی صورت میں نکلتا تھا۔ میں نے ابن ماجہ کا سبق شروع کرنے سے پہلے ایک مفصل مقدمۃ العلم طلبہ کے سامنے بیان کیا جس میں علم حدیث کی بنیادی معلومات کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے نظریہ سنتِ جاریہ پر تفصیل سے گفتگو کی، اور اُسے منضبط بھی کرلیا۔ یہ بحث اب میرے اردو مقالات میں شائع ہورہی ہے۔ اس کے بعد مختلف سالوں میں سنن نسائی، طحاوی اور شمائل ترمذی پڑھانے کی نوبت آئی۔ اسی دوران موطأ امام مالک” کا درس میرے حصے میں آیا۔ مجھے اُس وقت یہ احساس ہوا کہ چار امہات کتب (بخاری، ترمذی، مسلم اور ابوداود) کے سوا باقی تمام کتابوں میں جو جزوی طور پر پڑھائی جاتی ہیں، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوۃ ہی کا تکرار ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے جب موطأ امام مالک” مجھے پڑھانے کو ملی، تو میں نے سوچا کہ اسے ابتدا سے پڑھانے کے بجائے کتاب البیوع سے پڑھانا میرے اور طلبہ کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس کی "کتاب البیوع" شروع کرادی۔ اس وقت مجھے اس کی مشکلات کا اندازہ نہیں تھا لیکن جوں جوں درس آگے بڑھا، اس کی مشکلات کا اندازہ ہوا، اور بعض مقامات پر تو دانتوں پسینہ آگیا۔ درحقیقت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی اصطلاحات ان کی اپنی خصوصیت ہیں، اور بعض اوقات ان کو سمجھنے کے لئے مطالعے میں کئی کئی گھنٹے صرف ہوجاتے تھے، اور موطأ کی جتنی شروح مہیا تھیں، ان سب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مالکی فقہ کا اسلوب کچھ نہ کچھ دسترس میں آگیا۔

ہمارے دورۂ حدیث میں پڑھنے کے وقت سے صحیح بخاری” کا درس حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی دیا کرتے تھے۔ اور ترمذی کا درس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا۔ یہ دونوں بزرگ یکے بعد دیگرے دارالعلوم سے چلے گئے، تو صحیح بخاری” کا درس حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اپنے ذمے لے لیا، اور جامع ترمذی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع میں ہمارے لسبیلہ ہاؤس کے مکان ہی میں مقیم تھے، اور ہفتے میں دو چار مرتبہ دارالعلوم شرافی تشریف لاتے تھے، لیکن جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں، ۴؍ اپریل ۱۹۶۳ء مطابق ۹ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ سے انہوں نے اپنے شہر کے کاموں کو سمیٹ کر صحیح بخاری” کے درس کی خاطر دارالعلوم ہی میں رہائش کا فیصلہ فرمالیا تھا۔ لسبیلہ کے مکان میں ہمارے دونوں بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب (رحمہ اللہ تعالیٰ اور جناب محمد ولی رازی صاحب مد ظلہم مقیم رہے) والدین کے دارالعلوم میں منتقل ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی یہ سہولت ہوگئی تھی کہ ابتک ہم والدین سے دور دارالعلوم میں قیام پر مجبور تھے۔ اب الحمدللہ

والدین کے سائے میں گھر کی سہولتیں میسر آ گئیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی ہمہ وقت صحبت اور خدمت سے جو محرومی تھی، وہ دور ہوئی، اور اب حضرتؒ کی براہ راست تربیت میسر آ گئی، اور ان کے کاموں کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ کی مصروفیات اتنی مختلف انداز کی تھیں کہ اس کے لئے آپ کو لمبے لمبے سفر بھی کرنے پڑتے تھے، اور بکثرت شہر کی آمد و رفت بھی رکھنی پڑتی تھی، اس لئے آخر کار صحیح بخاریؒ کا درس نبھانا آپ کے لئے مشکل ہو گیا، اور اب آپ نے یہ درس حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ کی طرف منتقل کرنے کا فیصلہ فرما لیا جو اُس وقت تک جامع ترمذیؒ پڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد دار العلوم کی نظامت تعلیمات بھی تھی، اس لئے وہ صحیح بخاریؒ کے درس کے ساتھ ترمذی کا درس جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوا کہ ترمذی کا درس جو دورۂ حدیث میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے، وہ کس کے سپرد کیا جائے؟ اس موقع پر حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو تجویز دی کہ اب یہ سبق تقی کو منتقل کر دیا جائے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور نا اہلی کا احساس تھا، اس لئے شروع میں تأمل ہوا، لیکن بڑوں کے حکم کی وجہ سے میں نے یہ سوچا کہ جب اپنی طلب کے بغیر بڑے کوئی کام سونپ دیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان شاء اللہ توفیق بھی ملے گی۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کا نام لیکر یہ درس شروع کرا دیا، اور پھر تقریباً بیس سال یہ سبق میرے پاس رہا۔ شروع میں اس درس کے مطالعے میں مجھے تقریباً تین چار گھنٹے لگ جاتے تھے۔ میرا حافظہ کمزور تھا، اس لئے میں مطالعے کے دوران یادداشتیں تیار کرتا، اور درس سے پہلے ان پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ درس کی تقریر میں نے پہلے سال املاء کرائی، لیکن بعد میں املاء کا طریقہ چھوڑ دیا، اور ایران کے ایک طالب علم مولوی عطاء اللہ صاحب نے جو تقریر ضبط کی تھی، وہ کئی سال میں نے اپنے سامنے رکھی، اور ہر سال اُس میں حذف و اضافہ کرتا رہا۔ حاشیے پر اکثر اپنے مآخذ کے حوالے بھی لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جس سال میرے بھانجے مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ (۱) (جو ماشاء اللہ اب خود جامع ترمذی کے مقبول استاذ ہیں) دورۂ حدیث سے فارغ

---

(۱) جس وقت یہ تحریر لکھی گئی تھی، اس وقت مولانا رشید اشرف صاحب بقید حیات تھے، اور جامع ترمذی کا درس دیتے تھے لیکن افسوس ہے کہ آج جب یہ تحریر شائع ہو رہی ہے، وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یکم جنوری ۲۰۱۹ء کو ان کی وفات ہمارے لئے اور ان کے ہزاروں جاں نثار ساتھیوں کے لئے بہت بڑا سانحہ تھی اور ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آتا ہے کہ: ع: خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

ہوئے، اور انہوں نے میری تقریر ترمذی کو تحقیق وتخریج کے ساتھ مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو میں نے اپنی یادداشتیں بھی انہیں دیدیں، اور پھر انہوں نے ماشاء اللہ اتنی قابلیت اور تحقیق ونکتہ رسی کے ساتھ اُسے مرتب کیا اور اُس میں اپنی طرف سے گراں قدر اضافے بھی کئے کہ وہ بفضلہٖ تعالیٰ "درس ترمذی" کے نام سے شائع ہوئی، اور ترمذی کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ایک مأخذ بن گئی۔ افسوس ہے کہ مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ کے سر بہت سی انتظامی ذمہ داریاں آگئیں، جن کی وجہ سے وہ اپنا کام تین جلدوں میں کتاب الطلاق تک پہنچا سکے۔ ادھر طلبہ کا اصرار تھا کہ باقی ماندہ تقریر بھی جلدی طبع ہو۔ ان کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے (جو اس وقت دار العلوم کی شاخ بیت المکرم کے ناظم ہیں) باقی ابواب کی تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کرلی، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اُسے جوں کی توں کسی مزید تحقیق وتخریج کے بغیر شائع کردیا جائے، اور مولانا رشید اشرف صاحب کو جب موقع ملے، وہ ان ابواب پر بھی اپنا تحقیقی کام جاری رکھیں۔ میں نے اس تجویز کو اس طرح منظور کرلیا کہ یہ حصہ "درس ترمذی" کے بجائے "تقریر ترمذی" کے نام سے شائع ہوجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کتاب الطلاق سے آگے کتاب البیوع وغیرہ کے ابواب تقریر ترمذی کے نام سے شائع ہوگئے جو الحمد للہ طلبہ کی ضرورت پوری کررہے ہیں، لیکن ان پر ابھی اُس طرح کا کام باقی تھا جیسا مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ نے "درس ترمذی" پر کیا تھا۔ چنانچہ دار العلوم کے ایک اور فاضل ومحقق مولانا ابوبکر احسان صاحب سلمہ نے جو مردان میں ایک بڑے مدرسے اور مرکز تحقیق کے سربراہ ہیں، بذات خود بڑی قابلیت اور تحقیق سے یہ کام شروع کیا، اور اب وہ مکمل ہوکر شائع ہونے والا ہے۔

تقریباً بیس سال میں جامع ترمذی ہی پڑھاتا رہا اور صحیح بخاریؒ ہمارے محبوب استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوتی تھی۔

۲۰۰۰ء میں عید الاضحیٰ کے بعد حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر ان کے فقہی مذاکرے میں شرکت کے لئے میں ہندوستان روانہ ہوا۔ مذاکرہ بہار کے دار الحکومت پٹنہ میں ہونا تھا، جس کے بعد میرا ارادہ لکھنو، دیوبند، تھانہ بھون وغیرہ حاضر ہونے کا تھا، اور پھر دہلی سے میری سیٹ لندن کے لئے بک تھی کیونکہ مجھے وہاں ایک اجتماع میں شرکت کرنی تھی۔ میں دہلی سے ہوتا ہوا پٹنہ پہنچا، اور مذاکرے میں شریک ہوا، لیکن دوسرے ہی دن مجھے وہاں بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کا فون پہنچا، اور انہوں نے یہ جانکاہ خبر دی کہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہ وفات پاگئے ہیں۔ اس صدمے نے

مجھے ہلا دیا۔ اور میں اپنا باقی تمام سفر ملتوی کر کے افتاں خیزاں واپس کراچی پہنچا۔ حضرتؒ کی نہ آخری زیارت مقدر میں تھی، اور نہ جنازے اور تدفین میں شرکت۔ پورا دارالعلوم سوگوار تھا۔ حضرتؒ کی وفات سے کئی جہتوں میں زبردست خلا پیدا ہوا، اور خاص طور سے صحیح بخاریؒ کے درس کا معاملہ بہت اہم تھا۔ حضرت بھائی صاحب دامت برکاتہم نے حکم فرمایا کہ اب صحیح بخاری" کا درس تمہیں دینا ہوگا۔ دوسرے اساتذہ بھی اسی تجویز پر متفق تھے۔ میں ایک عالمِ حیرت میں تھا۔ کہاں صحیح بخاریؒ اور کہاں میں؟ اس تجویز پر عمل کرنا ایک جسارت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بڑوں کا حکم تھا، اس لئے اپنی نااہلی کے احساس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر یہ ذمہ داری لے لی، اور اس سال میں نے اپنی دوسری مصروفیات اور اسفار کو کم کر کے زیادہ توجہ صحیح بخاریؒ کے درس کو دی، اور اُس کے لئے تین چار گھنٹے روزانہ مطالعہ کا معمول بنایا جس میں بخاری کی بیشتر شروح مطالعے میں رہتیں، لیکن متعدد تجربات کے بعد میں نے مطالعے کی اصل بنیاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "لامع الدراری" اور کتاب الصلوۃ کی ابتدا تک حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری، یعنی "فضل الباری" کو بنایا۔

چند سال صحیح بخاریؒ کی دونوں جلدیں پڑھانے کی نوبت آئی۔ اس دوران مولانا انور حسین صاحب نے جو چند سال پہلے دارالعلوم سے فارغ ہوئے تھے، میری تقریر بخاری کو ٹیپ کر کے اُسے قلم بند کرنا بھی شروع کردیا جو بعد میں " انعام الباری "کے نام سے انہوں نے شائع کی، اور اب تک اُس کی گیارہ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ چند سال بعد میں نے بخاری شریف کی جلد ثانی اپنے لائق وفائق بھتیجے مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب کے سپرد کردی جسے انہوں نے بڑی قابلیت اور افادیت کے ساتھ پڑھایا۔ پھر انہیں دل کا شدید دورہ ہوا، جس کے نتیجے میں ایک سال وہ تدریس سے بالکل قاصر رہے، تو دوبارہ دونوں جلدوں کی خدمت کی توفیق ہوئی۔ پھر چند سال جلد ثانی کا بیشتر حصہ انہوں نے پڑھایا، اور کچھ حصہ میں نے۔ الحمد للہ اب کئی سال سے ایک بار پھر جلد ثانی مکمل طور پر وہی پڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت عمر اور علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں، اور ان کے فیوض کو جاری وساری رکھیں۔ آمین۔

☆☆☆